جملہ حقوق محفوظ

سوہنی مہینوال

پنجاب کی ایک سچّی کہانی

جسے

بچّوں کیلئے آسان زبان میں لکھا گیا

سنہ ۱۹۴۰ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل

قیمت ۴ر

Taj Tahir Foundation

جملہ حقوق محفوظ

سوہنی مہینوال

پنجابی زبان کی ایک دِل چسپ کہانی

آسان اردو میں

سنہ ۱۹۳۹ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل

قیمت ۲/ آنے

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

مرزا عزّت بیگ

کوئی تین سَو سال ہوئے۔ بلخ بخارا کے علاقے میں ایک بہت بڑا سَوداگر تھا۔ جِس کا کاروبار دُور دُور پھیلا ہؤا تھا۔ اِس سَوداگر کا نام مرزا عالی تھا۔ اور اُس نے اپنی ایمانداری اور نیک نیتی کے سبب تمام ملکوں میں شُہرت حاصل کرلی تھی ؛

مرزا عالی کے گھر میں کِسی چیز کی کمی نہ تھی۔ نوکر چاکر۔ گھوڑے ہاتھی۔ روپیہ پیسہ سب کچُھ میسّر تھا۔ مگر سَوداگر اِن تمام آسایشوں کے باوجود پریشان رہتا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی۔کہ اُس کے ہاں کوئی اَولاد نہ تھی ؛

مرزا عالی نے اَولاد کے لئے روپیہ پانی کی

Taj Tabir Foundation

طرح بہایا۔ مَنّتیں مانیں۔ پیروں فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر دُعائیں کرائیں۔ خدا کی مرضی کہ سوداگر بڑھاپے کی عُمر تک پہنچ گیا۔ لیکن اُس کے گھر کوئی اولاد نہ ہوئی +

ایک دفعہ کِسی شخص نے مرزا عالی کی خدمت میں حاضر ہو کر بتایا۔ کہ "یہاں سے دُور ایک پہاڑ کی کھوہ میں ایک فقیر دُنیا سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اُس کی زبان میں کچھ ایسا اثر ہے۔ کہ اُس کے مُنہ سے جو بات نِکل جاتی ہے۔ ضرور پُوری ہو کے رہتی ہے۔ آج تک کوئی شخص اُس کے پاس جا کر نامُراد واپس نہیں آیا۔ اگر آپ اُس سے دُعا کرائیں۔ تو کیا عجب کہ خُدا آپ کی مُراد بر لائے" +

سوداگر یہ سُنتے ہی اُس فقیر کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اور اپنا حال کہ سُنایا۔ سوداگر کی بپتا سُن کر فقیر کا دِل پگھلا اور اُس نے ہاتھ اُٹھا کے خدا سے دُعا مانگی پھر سر جُھکائے کچھ سوچتا رہا۔ بڑی دیر کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ اور کہنے لگا "جا بابا!

تیرے ہاں چاند سا لڑکا پیدا ہوگا"۔

مرزا عالی یہ خوش خبری لے کر خوش خوش گھر آیا۔ اب وُہ ہر وقت خوش نظر آتا تھا۔ اُس کا کار و بار جو دل کی پریشانی کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ پھر چمک اُٹھا۔ اور اُس کے کارندے بھی بڑی محنت سے کام کرنے لگے۔

کوئی ایک سال کے بعد مرزا عالی کے گھر ایک لڑکا پیدا ہُوا۔ مرزا نے اس خوشی میں لنگر کھلوا دئے۔ کہ جو آئے۔ کھائے اور دُعائیں دیتا چلا جائے۔ اِسی خوشی میں تمام مُلازموں اور کارِندوں کو انعام ملے۔ اور ان کی تنخواہوں میں ترقّی ہوئی۔ سوداگر نے اپنے عقلمند اور دانا کارندوں سے مشورہ کر کے لڑکے کا نام مرزا عزّت بیگ رکھا۔

عزت بیگ ماں باپ کا اِکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی پرورش بڑے لاڈ پیار اور چاؤ چوچلے سے ہو رہی تھی۔ جب وہ ذرا سیانا ہوُا تو بڑے بڑے عالم اُس کو تعلیم دینے کے لئے مُقرّر کئے گئے۔

Taj Tahir Foundation

عزّت بیگ صرف شکل و صورت کا ہی اچّھا نہ تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ وہ بہت ذہین بھی تھا۔ چنانچہ اُس نے تھوڑے ہی دنوں میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ اور بڑی بڑی مشکل کتابیں اس طرح فرفر پڑھنے لگا کہ استاد دنگ رہ گئے۔

بارہ سال کی عُمر میں مرزا عالی نے اپنے بچّے کو تیر اندازی۔ شہسواری اور سپہگری کے دوسرے فن سکھانے کے لئے اُستاد مُقرر کئے۔ عزت بیگ نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ تمام فن سیکھ لئے اور اُس کا شمار ترکستان کے نامور شہسواروں میں ہونے لگا۔

اب مرزا عالی کے دل کو تسلّی تھی۔ کہ اُس کے بعد اُس کی دولت غیروں کے کام نہ آئے گی۔ بلکہ اُس کا لائق فرزند اُس کے کام کو سنبھال لے گا۔ اور اپنی لیاقت اور قابلیت سے بزرگوں کا نام روشن کرے گا۔

مرزا عزت بیگ کی اُٹھتی جوانی تھی۔ گھر میں

Taj Tahir Foundation

اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اس لئے اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و شکار کو نکل جاتا۔ اور کئی کئی دن جنگلوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ اُس نے لوگوں سے اکثر سُنا تھا۔ کہ یہاں سے دُور ہندوستان کا ملک ہے۔ جس کا پایہ تخت دِلّی بڑا خوبصورت شہر ہے۔ چنانچہ دُور دُور کے لوگ وہاں سیر کرنے جاتے ہیں۔ ہوتے ہوتے مرزا عزّت بیگ کے دل میں بھی دِلّی کی سیر کا شوق پیدا ہُوا۔ اُس نے اپنے دوستوں سے اس بات کا ذکر کیا۔ تو اُنھوں نے بھی یہی رائے دی۔ ان کی باتوں سے عزّت بیگ کا شوق اَور بڑھ گیا اَور اس نے ایک دن موقع پا کے باپ سے دِلّی کی سیر کی اِجازت چاہی ؂

مرزا عالی بُوڑھا ہو چکا تھا۔ اُسے اب بہت عرصے تک زندہ رہنے کی کوئی اُمّید نہ تھی۔ اُس نے اپنے بیٹے کو پیار کر کے پاس بٹھا لیا اور کہا۔ "بیٹے! مَیں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ انسان کی

Taj Tahir Foundation

زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ مَیں نہیں چاہتا۔ کہ تم ایک لمحہ کے لئے بھی میری آنکھوں سے دور رہو۔ اس لئے میں تو یہی چاہتا ہوں۔ کہ جب تک مَیں زندہ ہوں میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ جب میری آنکھیں بند ہو جائیں۔ پھر جو چاہے کرنا"۔

مرزا عزّت بیگ کے دل میں دہلی کی سیر کا شوق سمایا ہؤا تھا۔ اُس نے باپ سے کہا۔ "ابّا جان! خدا آپ کا سایہ دیر تک میرے سر پر قائم رکھے۔ آپ اللہ کے رحم و کرم پر نظر رکھیئے۔ مَیں دہلی سے جلد واپس آجاؤں گا۔ مَیں یہ چاہتا ہوں۔ کہ مَیں آپ کی زندگی ہی میں تجارت کا سلیقہ حاصل کرلُوں اور آپ جانتے ہیں کہ کاروبار کا سلیقہ اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا بہت ضروری ہے۔

مرزا عالی نے بیٹے کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہؤا۔ آخر بُوڑھے باپ نے جوان بیٹے کی بات مان لی۔

مرزا عزت بیگ باپ سے اجازت لے کر

Taj Tahir Foundation

ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اجازت چاہی۔ وہ بچاری یہ سُنتے ہی رو پڑی۔ اور بیٹے کو گلے لگا کر کہا " بیٹا! بُڑھیا ماں کو تنہا چھوڑ کر اس قدر لمبے سفر پر نہ جاؤ۔ تم چلے گئے۔ تو مَیں چند دن بھی زندہ نہ رہ سکُونگی" +

مرزا عزّت بیگ نے ماں کو بھی تسلّی دی اور کہا۔ کہ " مجُھے خوُد آپ کے قدموں سے دُور رہنا منظور نہیں۔ مگر چاہتا ہوں۔ کہ آپ کی زندگی میں کاروبار سنبھال لُوں۔ اور دُنیا کی مصیبتوں کا کچُھ اندازہ کر لُوں۔ آپ یقین کریں۔ کہ مَیں بہت جلد واپس آجاؤں گا۔ اور آپ کی دُعائیں ساتھ رہیں۔ تو مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی" +

ماں بچاری اپنے جوان اور پیارے فرزند کی ضِد کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی؟ ناچار مان گئی۔ اور مرزا عزت بیگ کو دہلی کی سَیر کے لئے جانے کی اِجازت دے دی +

دِلّی کا سفر

ماں باپ سے اِجازت مِلتے ہی مرزا عزت بیگ نے تیاریاں شروع کر دیں ۔ دہلی کے بادشاہ شاہ جہاں کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے قیمتی تحفے حاصل کئے ۔ اور کئی دنوں کی کوشِش کے بعد ایک بہت بڑا قافلہ دِلّی جانے کے لئے تیار ہو گیا ۔

بلخ سے دِلّی ایک تو کالے کوسوں کا سفر ہے۔ دوسرے راستہ میں کہیں اُونچے پہاڑوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہیں ندی نالے اور دریا پڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ قدم قدم پر ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ ! اسی لئے لوگ اپنے عزیزوں کو رُخصت

Taj Tahir Foundation

کرتے وقت اپنی طرف سے آخری بار مل لیتے تھے۔
کہ شاید پھر ملاقات ہو یا نہ ہو ×

جب مرزا عزّت بیگ سفر کا سارا سامان تیار کر چکا۔
تو ماں باپ سے رخصت ہو کر ہندوستان کا رُخ کیا۔
اگرچہ دِلّی دیکھنے کا شوق دِل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔
لیکن ماں باپ اور دوستوں کی جُدائی کا بھی بہت
افسوس تھا۔ جب تک بلخ کے اُونچے مکان اور
مسجدوں کے مینار نظر آتے رہے۔ اُس کے جی کو
ڈھارس سی رہی۔ جب شہر نظروں سے اوجھل ہو گیا
تو اُس کا جی ڈُوبنے لگا ×

مرزا عالی کے نام کی سب جگہ دھوم تھی۔ اُس
کے بیٹے مرزا عزت بیگ کی شُہرت بھی دُور دُور
تک پہنچ چکی تھی۔ اِس لئے یہ قافلہ جہاں جہاں پہنچا۔
لوگوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا ×

ایک مُدّت کے سفر کے بعد مرزا عزت بیگ
اپنے قافلے سمیت صحیح سلامت دِلّی آ پہنچا۔ اُس
زمانے میں شاہ جہاں ہندوستان پر حکومت کرتا

Taj Tahir Foundation

تھا۔ عزّت بیگ دِلّی پہنچ کے ایک سرائے میں ٹھہرا۔ کچھ دِن آرام کیا۔ پھر اچھّے اچھّے تحفے لے کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوا ۔

شاہ جہاں نے عزت بیگ کی بہت عزت کی۔ اُس کے تحفے قبول کر کے اُسے خلعت اور انعام بخشا ۔

بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد عزت بیگ نے جی بھر کر شہر کی سیر کی۔ اُس نے دلّی کی جس قدر تعریف سُنی تھی۔ اُسے اُس سے بڑھ کر پایا ۔

کچھ دِن دِلّی رہنے اور اُس کی اچھّی طرح سیر کرنے کے بعد مرزا عزّت بیگ کو ماں باپ کا خیال آیا۔ اور اُس نے سفر کا سامان باندھنے کا حُکم دے دیا۔ جو جو چیزیں ضروری تھیں وہ خرید لی گئیں۔ اور مرزا عزت بیگ اپنے ہمراہیوں سمیت دِلی سے واپس ہُوا ۔

مرزا عزّت بیگ نے جاتے ہوئے تو دلّی کی

Taj Tahir Foundation

سَیر کے شوق میں کہیں قیام نہ کیا تھا۔ مگر واپسی پر بڑے بڑے شہروں میں ٹھہر کر اُن کی سَیر کی۔ لاہور پہنچ کر چند روز یہاں ٹھہرا۔ اور یہاں کی سَیر کر کے بہت مسرُور ہوُا ۔

یوں تو مرزا عزت بیگ نے وطن لے جانے کے لئے بہت سے تحُفے دِلّی ہی سے خرید لئے۔ مگر راستے میں جو شہر بھی آتا تھا۔ عزت بیگ وہاں کی مشہور چیزیں بھی خرید لیتا تھا ۔

Taj Tahir Foundation

گُجرات

لاہور سے روانہ ہو کر مرزا عزّت بیگ کا قافلہ گجرات پہنچا۔ گجرات اب تو دریاے چناب سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔ مگر اُس زمانے میں چناب گجرات کے بالکل قریب بہتا تھا۔ گجرات بہت آباد شہر تھا۔ یہاں کے مٹّی کے برتن بہت مشہور تھے اور دُور دُور ان کی تجارت ہوتی تھی ۔

جب مرزا عزّت بیگ کا قافلہ گجرات پہنچا۔ تو اُس نے لوگوں سے پچھوایا۔ کہ یہاں کی کیا چیز مشہور ہے ؟ لوگوں نے بتایا۔ کہ یہاں مٹی کے برتن بہت اچھے بنتے ہیں۔ اور اس شہر میں بڑے بڑے کاریگر کمہار بستے ہیں۔ جن میں تُلّا کمہار سب

Taj Tahir Foundation

سے زیادہ نامور ہے۔ تُلّا ایسے خوبصورت برتن بناتا ہے۔ کہ اُنہیں ہر وقت دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے ؎

مرزا عزّت بیگ کو تُلّا کے ہاتھ کے بنے ہوئے برتن دیکھنے اور اُن کو وطن لے جانے کا شوق ہُوا۔ چنانچہ اُس نے اپنے ایک خاص نوکر کو بھیجا۔ کہ "تُلّا کی دُکان تلاش کرکے وہاں سے چند برتن خرید کر لے آؤ" ؎

نوکر پوچھتا پوچھتا تُلّا کمہار کی دُکان پر پہنچ گیا۔ دُکان پر تُلّا کی نوجوان لڑکی بیٹھی برتنوں پر بیل بُوٹے بنا رہی تھی۔ یہ لڑکی ایسی خوبصورت تھی۔ کہ اُسے دیکھ کر عزّت بیگ کے نوکر کو برتنوں کا خیال ہی بھُول گیا۔ اور وہ دیر تک کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ آخر جب تُلّا نے اُس سے پوچھا۔ کہ تُم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ تو اُسے خیال آیا۔ کہ مَیں تو برتن خریدنے آیا تھا۔ چنانچہ اُس نے دو چار برتن پسند کرکے خرید لئے اور عزّت بیگ کے پاس آ گیا ؎

Taj Tanir Foundation

عزّت بیگ برتنوں کی بناوٹ اور اُن کے خوبصورت نقش ونگار کو دیکھ کر بہت خُوش ہوُا۔ اُس نے نوکر سے پوچھا۔ کہ کیا ایسے برتن اَور بھی مِل سکتے ہیں؟ نوکر نے کہا۔ "حضور! آپ نے تو ابھی یہ برتن اور بیل بُوٹے ہی دیکھے ہیں۔ لیکن جو کچُھ مَیں دیکھ آیا ہُوں۔ اگر آپ وُہ دیکھیں۔ تو یہ سب کچھ بھُول جائیں"۔

مرزا عزّت بیگ نے جواب دیا۔ "مَیں تمُہارا مطلب نہیں سمجھا۔ صاف صاف بیان کرو"۔

نوکر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور! بے شک یہ نقش ونگار بہت خوبصورت ہیں۔ لیکن آپ اگر اُن ہاتھوں کو دیکھیں جن سے یہ نقش بنائے گئے ہیں۔ تو اِن بیل بُوٹوں کی خوبصورتی کو بالکل بھول جائیں"۔

عزّت بیگ نے پوچھا۔ "یہ نقش کِس نے بنائے ہیں؟"

نوکر نے کہا۔ "تُلاّ کُمہار کی نوجوان لڑکی نے

جو حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ ہے۔ میں تو اُسے دیکھ کے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اگر مجھے اُس کا باپ چونکا نہ دیتا۔ تو خُدا جانے میں کب تک اُسے دیکھنے میں محو رہتا۔ یقین کیجیے۔ کہ چودھویں رات کا چاند اُس کے حسن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وہ کوئی پری ہے۔ یا جنّت کی کوئی حُور تُلّا کمہار کے گھر آ بسی ہے"۔

یہ باتیں سُن کر عزّت بیگ کے دِل میں تُلّا کی دُکان دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور وُہ اُسی وقت نوکر کو ساتھ لے کر کمہار کی دُکان کی طرف چل پڑا۔

جب عزّت بیگ اور اُس کا نوکر دُکان پر پہنچے۔ تو تُلّا برتن بنانے میں مصروف تھا۔ عزت بیگ بڑے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ تُلّا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور پُوچھا "آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے"؟

عزّت بیگ نے جواب دیا۔ کہ "میں نے آپ کے بنائے ہوئے کچھ برتن دیکھے ہیں وہ

مُجھے بہت پسند آئے ہیں۔ مُجھے کچھ اَور برتن دِکھائیے۔ اگر پسند آئیں گے۔ تو مَیں خرید لُوں گا۔"

تُولّا خُود چُونکہ کام میں مصروف تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنی بیٹی کو بُلا کر کہا۔ کہ "بیٹی! خاں صاحب کو ہر قسم کے برتن دکھا دو"۔

یہ سُن کر لڑکی اُٹھی اور عزّت بیگ کے سامنے آ کر پُوچھنے لگی۔ کہ "آپ کو کس قسم کے برتنوں کی ضرورت ہے"؟

عزّت بیگ نے لڑکی کو دیکھا تو اُسے کچھ سُدھ بُدھ نہ رہی۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور برتن دیکھنے شروع کر دیئے۔ کسی کو پسند کیا اور کوئی ناپسند کر کے واپس کر دیا۔ پھر بھی اِس قدر برتن پسند کئے۔ کہ اُس کے سامنے ایک ڈھیر لگ گیا۔ باتوں باتوں میں اُس نے لڑکی سے پُوچھا۔ کہ "تمہارا نام کیا ہے"؟

اُس نے بھولے پن سے جواب دیا "آپ میرا نام کیوں پُوچھتے ہیں"؟

Taj Tahir Foundation

عزّت بیگ نے جواب دیا۔" اس لیئے کہ مَیں اُس پیارے نام کا وِرد کرُوں گا"۔

لڑکی مُسکرا کر بولی۔" یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ اور مَیں یہ بات آپ کو کبھی نہ بتاؤں گی۔ کہ میرا نام 'سوہنی' ہے"۔

عزّت بیگ کو اُس کا یہ بھولا پن بہت پسند آیا۔ اور اُس نے کہا۔" اچھّا۔ آپ کی مرضی۔ آپ بے شک نہ بتائیے۔ کہ آپ کا نام 'سوہنی' ہے"۔

سوہنی گھبرا کر بولی۔" یہ آپ کو میرا نام کِس نے بتا دِیا"؟

عزّت بیگ نے کہا۔" تُمھاری شکل و صورت نے۔ تُمھارے بھولے پن نے اور خُود تُم نے"۔

عزّت بیگ کو تُلّا کے ہاں خاصی دیر ہو چُکی تھی۔ اگرچہ اُس کا جی وہاں سے اُٹھنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ آخر اُس نے جس قدر برتن پسند کیئے تھے۔ اُن کی قیمت ادا کی۔ اور برتن اُٹھوا کر سرائے کا رُخ کیا۔

Taj Tahir Foundation

اب اُس کے اپنے مکان پر بیٹھنا بہت مشکل تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ ہمیشہ سوہنی کی میٹھی میٹھی باتیں سُنتا رہے۔ اور کبھی سوہنی کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اب اُس نے ہر روز تلّا کے ہاں جانا اور برتن خریدنا شروع کر دیا۔ اس طرح اُسے روز سوہنی سے باتیں کرنے کا موقع مِل جاتا تھا۔

اسی طرح کئی دن گُزر گئے۔ اور عزّت بیگ نے برتن خرید خرید کر اُن کا ایک ذخیرہ جمع کر لیا۔ تُلّا بہت خُوش تھا۔ کہ اُسے ایک قدردان اور مالدار خریدار ہاتھ آیا۔ لیکن عزت بیگ کے نوکر چاکر حیران تھے۔ کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکتے تھے۔ کہ آخر اُن کا آقا اتنے برتنوں کو کیا کریگا۔ لیکن کسی کو اُس سے کچھ پُوچھنے کی جُرأت نہ ہوتی تھی۔

مرزا عزت بیگ کے پاس جس قدر روپیہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ختم ہو گیا۔ کیونکہ ایک تو

برتن خریدنے پر بہت سا روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ دوسرے نوکروں چاکروں اور اونٹ گھوڑوں کا خرچ اچھّا خاصا تھا۔ کچھ دِنوں کے بعد یہ حالت ہوگئی۔ کہ نوکر چاکر فاقے کرنے لگے۔ اُن میں سے ایک دو بُڈّھے نوکروں نے اُسے بہت سمجھایا بُجھایا۔ اور کہا۔ کہ اب آپ کو اس شہر سے چلنا چاہیئے۔ لیکن جب دیکھا۔ کہ مرزا پر کسی کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وُہ کمہار کی بیٹی کی محبت میں ایسا کھویا ہؤا ہے۔ کہ اُسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ تو وہ آہستہ آہستہ کِھسکنے لگے۔ اور آخر ایک دن ایسا آیا۔ کہ مرزا عزّت بیگ گجرات میں بالکل اکیلا رہ گیا۔

اب عزّت بیگ بہت پریشان ہؤا۔ دولت ختم ہوچکی تھی۔ خوبصُورت برتنوں کا ایک ڈھیر البتّہ موجود تھا۔ اس نے مجبور ہو کر برتنوں کی دُکان کھول لی۔ وہ اپنی دُکان پر سستے داموں برتن بیچ کر روپیہ حاصل کرتا اور روز نئے برتن خریدنے کے لئے سوہنی کے باپ کی دکان پر

پہنچ جاتا تھا۔

اِس انداز سے یہ تجارت کب تک چل سکتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں برتنوں کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا۔ اب عزت بیگ کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ اور نہ روپیہ کمانے کا کوئی طریقہ اسے معلوم تھا۔ آخر اُسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اور وُہ روتا ہؤا تُلّا کمہار کے پاس پہنچا۔ تُلّا اُسے جانتا تو مُدّت سے تھا۔ مگر اُسے اصل بات کا علم نہ تھا۔ عزّت بیگ کو روتے دیکھ کر اُسے بہت تعجّب ہؤا۔ اور وہ پُوچھنے لگا۔ "صاحب! خیر تو ہے"؟

عزّت بیگ نے کہا۔ کہ "میں ایک مُدّت سے یہاں برتنوں کی تجارت کر رہا تھا۔ آج رات کو میرا تمام مال واسباب اور روپیہ چور لوٹ کر لے گئے۔ اب میں نہ کسی کام کے قابل ہوں۔ اور نہ وطن پہنچ سکتا ہوں۔ خدا کے لئے آپ مجھ پر رحم کیجئے۔ اور مجھے اپنی غلامی میں لے لیجئے"۔

تُلّا بہت رحمدل تھا۔ عزّت بیگ کا حال سُن کر

اُس کے آنسو نکل آئے۔ اور اُس نے عزّت بیگ کو اپنے ہاں کام کرنے کے لئے نوکر رکھ لیا۔ چند دنوں تک وہ عزّت بیگ سے چھوٹے موٹے کام کراتا رہا۔ عزّت بیگ نے اس محنت سے کام کیا۔ کہ کمہار نے اُسے بھینس چرانے پر مُقرّر کر دیا + اسی سبب سے بلخ کے اس سوداگر زادے کو لوگ "مہینوال" کہنے لگے +

سوہنی کو عزّت بیگ سے محبت تو تھی۔ مگر یہ بات اُسے بھی معلوم نہ تھی۔ کہ عزّت بیگ نے صِرف اُس کی خاطر یہ ذِلّت قبول کی ہے + ایک دن مہینوال نے موقع پاکر سوہنی کو دردِ دِل کہہ سُنایا۔ سوہنی کو جب اصل بات کا علم ہُوا۔ تو وہ جگر تھام کر رہ گئی اور اُس کے سینے میں بھی محبّت کی آگ بھڑک اُٹھی +

اب مہینوال کے لئے بھینس چرانا بھی بادشاہت سے کم نہ تھا۔ وہ جسے چاہتا تھا۔ وہ اُسے حاصل ہو گئی تھی اور دونوں نے ایک دُوسرے

سے محبّت کا عہد کر لیا تھا۔

کچھ دنوں تک تو کسی کو اُن کی محبت کی خبر نہ ہوئی۔ مگر ایسی باتیں چھپائے کب چھپتی ہیں۔ لوگوں میں ان کی محبّت کا چرچا ہونے لگا۔ اور آہستہ آہستہ تُلّا کو بھی خبر ہوئی۔ وہ یہ سُنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ اُسی وقت مہینوال کو بُلا کر کہا۔ کہ "نمک حرام۔ تُو نے میرے ساتھ اچھّی نیکی کی ہے۔ جس درخت کا پھل کھا کر تیری گزر ہو رہی تھی۔ تُو اُسی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے۔ آج ہی میرے گھر سے نکل جا۔ اور پھر کبھی مجھے مُنہ نہ دکھائیو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

مہینوال کو گھر سے نکال کر تُلّا سوہنی کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔ "ناشدنی۔ تُو نے اس عمر میں میری عزّت کو بٹّہ لگایا۔ کاش۔ تُو پیدا ہوتے ہی مر جاتی اور مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا"۔

سوہنی یہ سُن کر سہم گئی۔ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ لیکن کیا کہتی۔ زبان بند ہو گئی۔ اور وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔

سوہنی کو بُرا بھلا کہہ کے "تُلّا" اپنی بیوی کے پاس آیا۔ اُسے ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا۔ "تُلّا" نے آتے ہی سر پیٹ لیا۔ اور کہنے لگا۔ "معلوم بھی ہے۔ تُمہاری بیٹی نے کیا گُل کھلایا"؟

سوہنی کی ماں چونک کر بولی۔ "کیا ہُوا"؟

"تُلّا" جھلّا کر بولا۔ "ہوا کیا؟ تُمہاری لاڈلی بیٹی چُھپ چُھپ مہینوال سے محبت کرتی رہتی ہے"۔

یہ سُن کر سوہنی کی ماں نے ایک دوہتّڑا اپنے سینے پر مارا اور جھلّاتی ہوئی سوہنی کے پاس گئی۔ سوہنی آگے ہی پریشان بیٹھی تھی۔ ایک تو بدنامی کا افسوس۔ دوسرے مہینوال کی جُدائی کا غم۔ اب جو ماں نے آکر بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ تو سوہنی نے ایسے انداز میں جیسے اُسے کسی بات کا علم ہی نہیں۔ تعجُّب سے پُوچھا۔ "اماں! مجھے خُدا کے لئے یہ تو بتاؤ۔ کہ بات کیا ہے؟ ابھی ابھی ابا جان خفا ہو کر گئے ہیں۔ کچھ پتہ بھی تو چلے"؟

ماں خفا ہو کر بولی۔ "ہاں۔ تجھے بھلا کچھ پتہ ہے۔

تُو تو بالکل انجان ہے ۔ کم بخت ۔ تجھے شرم نہ آئی۔ بوڑھے باپ کی عزّت میں بٹّہ لگایا۔ اور چھپ چھُپ کر مہینوال سے محبت کرتی رہی" ؟

سوہنی نے زیادہ تعجّب سے کہا۔" مہینوال سے محبّت ؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟ اماں جان ! آپ کو جوان جہان بیٹی پر ایسا الزام لگاتے کچھ تو خیال کرنا چاہیئے"۔

ماں نے کر جواب دیا۔ بیٹی ذرا ہوش کر ! میں نے تجھے جنا ہے۔ تو نے مجھے نہیں جنا۔ مَیں اُڑتی چڑیا کے پر گنتی ہوں۔ مجھے کیا اتنا بھی معلوم نہیں"۔

یہ سُن کر سوہنی سے نہ رہا گیا۔ اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسُو آ گئے۔ وہ رو کر کہنے لگی۔ " اماں جان۔ اگر یہ بات ہے۔ تو یہ سمجھ لیجئے۔ کہ تقدیر میں یہی تھا۔ اِس میں میرا کیا قصُور" ؟ یہ کہہ کے اُس نے زار و قطار رونا شروع کر دِیا ۔

Taj Tahir Foundation

بیٹی کو روتے دیکھ کر ماں کچھ اَور نہ کہہ سکی۔
اُسے روتا چھوڑ کے چلی گئی۔ اور خاوند سے کہنے
لگی۔ کہ اب سوہنی کو گھر بٹھائے رکھنا مناسب نہیں۔
کوئی اچھّا سا گھر دیکھ کر اس کا بیاہ کر دینا چاہیئے۔
تُلّا کو بیوی کی یہ بات پسند آئی۔ اور سوہنی کے
رشتہ کی تلاش ہونے لگی ۔

Taj Tahir Foundation

شادی

سوہنی ایک نو جوان تھی۔ دُوسرے چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اُس کے لئے موزُوں رشتہ تلاش کرنے میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ دو تین دن ہی میں ناطہ قرار پا گیا۔ اور چھ سات دن بیچ میں رکھ کر شادی کا دِن مُقرّر ہو گیا۔

اپنی شادی کی خبر سُن کر سوہنی کو بہت دُکھ ہوُا۔ وہ اپنے دل سے زندگی کا ساتھی چُن چُکی تھی۔ اور اُس سے عہد بھی ہو چکا تھا۔ لیکن ماں باپ کے سامنے اُس کی زبان کیسے کھُل سکتی تھی۔ چُپ چاپ بیٹھی روتی رہتی۔ اُسے دِن رات اِس کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔

Taj Tahir Foundation

اِدھر سوہنی کا یہ حال تھا۔ اُدھر مہینوال گلی کوچوں کی خاک چھان رہا تھا۔ اُس کے لئے زمین آسمان میں کہیں جگہ نہ تھی۔ اور جگہ ہوتی بھی۔ تو سوہنی سے دُور رہ کے چین کہاں؟

شادی کی تاریخ نزدیک آرہی تھی۔ سوہنی اور مہینوال دونوں بہت پریشان تھے۔ آخر سوہنی نے ایک سہیلی کے ذریعے مہینوال کو بُلا بھیجا۔ شہر کے باہر درختوں کا ایک جھُنڈ تھا۔ جہاں جھُٹپُٹے کے وقت یہ دونوں مِلے۔ سوہنی مہینوال کو دیکھ کے خوب روئی۔ اور پھر کہنے لگی۔ میرے ماں باپ نے میرا بیاہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ مگر مَیں تُم سے قول ہار چُکی ہوں۔ کہ زندگی بھر تمہاری ہو کے رہوں گی۔ میرے اس وعدے کو پتھّر کی لکیر جانو۔ خُدا نے چاہا۔ تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گی۔

مہینوال نے بھی عہد نباہنے کی قسم کھائی اور دونوں حسرت بھرے دلوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

Taj Tahir Foundation

سوہنی کی شادی بڑے دُھوم دھڑکے اور باجے گاجے سے ہوئی۔ براتی خوب بن ٹھن کر آئے تھے۔ طبلہ کھڑک رہا تھا۔ اور شہنائیوں کی آواز میں کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ دونوں فریقوں نے خوب جی کھول کے روپیہ خرچ کیا۔ کئی دن ناچ رنگ کی محفلیں رہیں۔ آخر ماں باپ نے اپنی حیثیت سے زیادہ جہیز دے کے بیٹی کو رخصت کر دیا۔

سوہنی کی آنکھوں میں مہینوال کی صُورت سمائی ہوئی تھی۔ رات دن اُسی کا دِھیان تھا۔ اُسے مہینوال کے بغیر نہ میکہ اچھا لگتا تھا۔ اور نہ سُسرال میں کوئی خوشی نصیب تھی۔ سُسرال والے نئی دُلھن کو خوش کرنے کی بہت کوششیں کرتے تھے۔ مگر سوہنی کی اُداسی کسی طرح دُور نہ ہوتی تھی۔ ماں باپ نے اُس کی شادی کر کے اُس کے ساتھ کوئی بھلائی نہ کی تھی۔ بلکہ اُس کی جان عذاب میں ڈال دی تھی۔ اگر وہ اُس کی شادی مہینوال کے ساتھ کر دیتے۔ تو وہ دونوں آرام اور چین سے

Taj Tahir Foundation

زندگی بسر کرتے ۔ مگر اُنہوں نے اپنی لڑکی کو ایک ایسے مرد کے پلّے باندھ دیا تھا ۔ جِس کی صورت دیکھنا بھی اُسے گوارا نہ تھا ؏

سوہنی نے جی میں یہ بات ٹھان رکھّی تھی ۔کہ مہینوال سے اُس نے جو وعدہ کیا ہے ۔ اُسے پُورا کر کے رہے گی ۔ نہیں تو کُنوئیں میں کُود کے جان دے دے گی ۔ لیکن کرنا خُدا کا کیا ہوُا ۔ کہ اُس کا خاوند شادی کے دن ہی بیمار ہو گیا ۔ ماں باپ نے بہتیرا علاج کرایا ۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوُا ۔ سُسرال والے سمجھتے تھے ۔ کہ یا تو بہو منحوس ہے ۔ یا اُس نے خاوند پر کوئی ایسا ٹونا ٹوٹکا کیا ہے ۔ کہ اچھّا ہونے میں نہیں آتا ۔ وہ روز سوہنی کو طعنے دیتے ۔ جلی کٹی سُناتے ۔ اور وہ نصیبوں جلی ایک کونے میں بیٹھی اپنی قسمت کو روتی رہتی تھی ۔ خاص طور پر اُس کی نند کو تو اُس سے سخت نفرت تھی ۔ اور وہ اُسے ستانے کے لئے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتی تھی ؏

Taj Tahir Foundation

یُونہی دن بِیتتے گئے۔ سوہنی نے بہتیرا چاہا۔ کہ کسی طرح مہینوال سے ملاقات ہو جائے۔ مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی ؎

ایک دن سوہنی کی ایک سہیلی جسے سوہنی اور مہینوال کی محبت کا تمام حال معلوم تھا۔ مہینوال کا حال پُوچھنے آئی۔ وہ بیچارا زندگی کے ہاتھوں تنگ۔ جان پر کھیل جانے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا۔ سوہنی کی سہیلی نے اُسے سمجھایا بُجھایا۔ تسلّی دی۔ اور کہا۔ کہ تمہیں سوہنی سے کچھ کہنا ہے۔ تو مجھ سے کہہ دو۔ میں آج اُس سے ضرور ملوں گی ؎

مہینوال نے اسے غیبی مدد سمجھا۔ اور سوہنی کو ایک درد بھرا خط لکھ بھیجا۔ خط میں اپنی دُکھ بھری زندگی کا ذکر کر کے سوہنی کو طعنہ دیا تھا۔ کہ "تم سُسرال میں مجھے بالکل بھُول گئیں۔ اور تم نے مجھ سے جو وعدے کر رکھے تھے۔ اُن کا بھی خیال نہ رہا" ؎

سہیلی نے موقع پا کر سوہنی کو خط دیا۔ وہ پہلے ہی

غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ مہینوال کا حال پڑھ کر اور اُس کے طعنے سُن کر جل بھُن کر کباب ہو گئی۔ اُس نے اُسی وقت جواب لکھا۔ کہ "مَیں تو سُسرال کی قید میں ہُوں۔ مگر تُم آزاد ہو۔ کسی طرح ملنے کی کوئی راہ نِکالو۔ ورنہ صبر سے تقدیر کے فیصلے کو برداشت کرو۔ اِتنا میں کہے دیتی ہوں۔ کہ مَیں نے اب تک وعدہ نبا ہا ہے۔ خدا نے چاہا۔ تو مرتے دم تک اِس پر قائم رہوں گی"۔

سوہنی کا خط پڑھ کر مہینوال کی آنکھیں کھُل گئیں۔ چونکہ سوہنی کی طرف سے کوئی پیغام نہیں آیا تھا۔ اس لئے اُسے یقین ہو چلا تھا۔ کہ سوہنی نے اُسے بھلا دیا۔ لیکن خط پڑھ کر اُسے اپنی بدگمانی پر افسوس ہُوا۔ اور وُہ سوچنے لگا۔ کہ مجھے سوہنی سے ملنے کی کوئی راہ نکالنا چاہئے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے فقیروں کا بھیس بدل کے سوہنی کے ہاں پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔

دُوسرے دِن گُجرات کی گلیوں میں ایک نیا فقیر

نظر آیا۔ اُس کی آواز میٹھی اور رسیلی تھی۔ اُس کی صدا میں ایک درد اور سوز تھا۔ لوگ اُس کی صدا سُن کے گھروں سے نکل آئے۔ وہ صدا لگاتا سوہنی کے دروازے پر پہنچا۔ سوہنی کی ساس کسی کام میں لگی ہوئی تھی۔ اُس نے سوہنی کو آواز دے کر کہا۔ "بیٹی! ذرا فقیر کو خیرات دینا۔ شاید اسی کی دُعا سے تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے اور تمہارے میاں بھی تندرست ہو جائیں"۔

سوہنی کو فقیر کی صدا سُن کر ایسا معلوم ہوُا۔ کہ اُس نے یہ پیاری صدا پہلے بھی سُنی ہے۔ وہ اُٹھ کر دروازے پر آئی۔ فقیر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے آنکھیں جُھکائے کھڑا تھا۔ اِسے دیکھ کر سوہنی کو خیال گزرا۔ کہ یہ کہیں مہینوال ہی نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی وہ ٹھٹک گئی"۔

فقیر نے پاؤں کی آہٹ پا کے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ سوہنی سے آنکھیں چار ہوتے ہی اُس کا جی بھر آیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو

Taj Tahir Foundation

گرنے لگے۔ کچھ کہنے سُننے کا موقع نہیں تھا۔ یہ کھٹکا برابر لگا ہؤا تھا۔ کہ کہیں ساس کو خبر نہ ہو جائے۔ سوہنی نے آہستہ سے کہا۔ کہ "تمہارا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ تُم سے ہو سکے۔ تو اِسی بھیس میں دریا کے پار جا بیٹھو۔ اور شہر کے باہر دریا کی طرف درختوں کا جو چھوٹا سا جُھنڈ ہے۔ وہاں ہر روز رات کو مجُھے مِلا کرو"۔

یہ سُن کر مہینوال کی جان میں جان آگئی۔ اور وہ اُسی وقت دریا کے پار جا پہنچا۔

Taj Tahir Foundation

دریا کے کنارے

دُوسرے ہی دن گجرات اور آس پاس کے سارے علاقے میں یہ بات پھیل گئی۔ کہ دریا کے کنارے ایک فقیر نے آکر ڈیرا لگایا ہے۔ چنانچہ اِس علاقہ کے اکثر حاجت مند لوگ فقیر کی خدمت میں حاضر ہوکر مرادیں مانگنے لگے۔ فقیر بھی کِسی کا دل نہ توڑتا۔ اور ہر حاجت مند کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتا۔ کہ "اے تمام دُنیا کی حاجتیں پُوری کرنے والے خُدا۔ سب لوگوں کی مُرادیں پُوری کر۔ اَور لوگوں کے ساتھ مجھ پر بھی رحم فرما"۔

فقیر کے دِن یُونہی گزرتے چلے گئے۔ ماہی گیر جو مچھلیاں پکڑتے تھے۔ اُن میں اُس کا حِصّہ بھی

Taj Tahir Foundation

لگاتے تھے۔ رات کو جب دُنیا سو جاتی۔ تو فقیر مچھلیوں
کے کباب لے کے درختوں کے جھنڈ تلے جا پہنچتا۔
سوہنی بھی آجاتی۔ دونوں سچّے دوست مِل کر بیٹھتے۔
دُکھ درد کی باتیں کرتے۔ اور اکٹھے کھانا کھا کر صُبح ہونے
سے پہلے اپنے اپنے مقام پر واپس آجاتے۔

یہ سلسلہ ایک مُدّت تک جاری رہا۔ اور کسی کو
کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔ دریا کی لہریں کبھی مہینوال
کا راستہ نہ روک سکیں۔ وُہ سوہنی کے دھیان میں ہنستا
کھیلتا دریا کے پار جا پہنچتا۔ اور جب مل کر واپس آتا۔
تو دوسرے روز کی مُلاقات کے تصوّر میں دریا کو عبور
کر کے اپنی جھونپڑی میں جا پہنچتا۔

ایک دن دریا چڑھا ہُوا تھا۔ شام تک نہ تو کوئی
کشتی آئی اور نہ کوئی مچھیرا فقیر کے لئے مچھلی لایا۔
فقیر ہر روز مچھلی کے کباب بنا کر لے جاتا تھا۔ اور
اُسے یہ کسی طرح گوارا نہ تھا۔ کہ کسی دن وہ خالی ہاتھ بھی
جائے۔ اُس نے کوشش کی۔ کہ وُہ خود کوئی مچھلی پکڑے
مگر کوشش کے باوجود کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی۔

اسی طرح رات ہو گئی۔ مہینوال بہت پریشان ہوا۔ وہ سوہنی کے پاس کسی طرح خالی ہاتھ نہ جانا چاہتا تھا۔ جب اُس کا کوئی بس نہ چلا تو دل کر کے چھُری سے اپنی ران کا سیر سوا سیر گوشت کاٹ لیا۔ اور ران کو کپڑے سے مضبوط باندھ کر گوشت کے کباب بنائے۔ کباب تیّار ہو چکے۔ تو وہ دریا میں کود پڑا۔

ایک تو وہ ران کی تکلیف سے بے حال تھا۔ دوسرے دریا بہت زوروں پر تھا۔ دریا کی پر شور لہروں نے بہت زور لگایا۔ کہ وہ کسی طرح ایک سچّے دوست کا رُخ دوست کی طرف سے پھیر دیں۔ مگر مہینوال لہروں پر فتح پا کر دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔

دوسرے کنارے پر سوہنی منتظر تھی۔ مہینوال کو دوست کی مُلاقات کے خیال میں ران کی تکلیف یاد تک نہ تھی۔ پہلے وہ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر مہینوال نے بھُنا ہوُا گوشت آگے بڑھایا۔

سوہنی نے لقمہ اُٹھایا۔ تو اُسے گوشت عجیب سا معلوم ہوُا۔ وہ کہنے لگی "پیارے! یہ گوشت مچھلی کا تو نہیں"؟

مہینوال نے جواب دیا "گوشت تو مچھلی ہی کا ہے"۔

سوہنی بولی "اسے ہاتھ لگاتے مجھے کچھ خوف سا معلوم ہوتا ہے"۔

یہ سُن کر مہینوال کے آنسو ٹپک پڑے۔ اُس نے ران پر سے پٹی کھول کر زخم دکھایا۔ اور کہا۔ کہ "اگر یہ گوشت پسند نہیں ہے۔ تو یہ میرے نصیبوں کا قصور ہے"!

سوہنی اس نظارے کو نہ دیکھ سکی۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ مہینوال کو روتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ "بس تمہاری طرف سے انتہا ہو گئی۔ تم نے اپنے عہد کو پورا کر دیا۔ اب مَیں روزانہ دریا کے اُس پار آ کر ملا کروں گی۔ تم آج کے بعد دریا کو عبور کرنے کی تکلیف نہ کرنا"۔

Taj Tahir Foundation

دریا کے اُس پار

مہینوال نہ چاہتا تھا۔ کہ وُہ سوہنی کو دریا عبُور کرنے کی تکلیف دے۔ مگر سوہنی نے اسے مجبُور کر دیا۔ اُس کی ران سے سیر سوا سیر گوشت کٹ گیا تھا۔ اور زخم بھرنے کے لئے بھی کچھ عرصہ چاہئے تھا۔ مجبوراً اُس نے سوہنی کا کہنا مان لیا ۔

دُوسری رات جب دُنیا رات کی سیاہ چادر اوڑھ کر سو گئی۔ اور سوہنی کی سسرال کے لوگ بھی میٹھی نیند کے مزے لینے لگے۔ تو سوہنی آہستہ سے اپنی چارپائی سے اُٹھی اور ایک گھڑا اُٹھا کے دریا کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات کی تاریکی۔ دریا کی لہریں اور بدنامی اُسے مہینوال کی محبت میں ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ وہ بے خطر بڑھتی گئی۔ اور گھڑے کے سہارے دریا کو عبور کر کے فقیر

Taj Tahir Foundation

کی جھونپڑی میں جا پہنچی ⁘

مہینوال سوہنی کی ہمّت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جب رات بیت چکی۔ اور مشرق کی طرف سپیدی پھیلنے لگی۔ تو سوہنی اُٹھی۔ مہینوال سے رخصت ہو کر چناب کی موجوں میں کُود پڑی۔ اور صُبح ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ گئی ⁘

ایک مُدّت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ سوہنی ہر روز رات کو گھڑے پر تیر کر دریا کے اُس پار جاتی اور مہینوال سے مل کر واپس آجاتی + واپس آتے ہوئے وہ گھڑے کو دریا کے کنارے جھاڑیوں میں چھپا دیتی۔ اور دوسرے روز وہیں سے اُٹھا لیتی ⁘

سوہنی اور مہینوال اس طرح دنیا کی آنکھوں سے چھپ چھپا کر اپنا اپنا عہد نباہ رہے تھے۔ اور دنیا ان کی حالت سے بے خبر تھی۔ لیکن آرام اور مسرّت کے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔ ایک رات سوہنی دریا کے کنارے اُس پار جانے کے ارادہ سے اُٹھی۔ تو قدموں کی چاپ سُن کر اُس کی نند کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے

Taj Tahir Foundation

جب دیکھا۔ کہ سوہنی آہستہ آہستہ گھر سے باہر نکل گئی ہے۔ تو اُسے بہت حیرت ہوئی۔ سوہنی کی نند اُس سے بہت نفرت کرتی تھی۔ اُس کو یقین تھا۔ کہ سوہنی کی نحوست کے سبب سے ہی میرا بھائی بیمار ہوگیا ہے۔ بلکہ ساری برادری میں اُسی نے یہ بات مشہور کردی تھی۔ کہ سوہنی نے میرے بھائی پر جادو کر رکھا ہے ؛

وہ پہلے بھی سوچا کرتی تھی۔ کہ سوہنی دن کو تو پریشان رہتی ہے۔ مگر جب رات ہوتی ہے۔ تو اُس کا چہرہ کِھل جاتا ہے۔ چنانچہ سوہنی جب دروازے کو آہستہ سے بند کرکے گھر سے نکل گئی۔ تو اُس کی نند بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ سے دروازہ کھول کر اُس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو پڑی ؛

تھوڑی دیر میں سوہنی دریا کے کنارے جا پہنچی۔ اُس کی نند سایہ کی طرح ساتھ لگی تھی۔ سوہنی نے جھاڑیوں میں سے گھڑا اُٹھایا۔ اور خدا کو یاد کرکے اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا ؛

سوہنی کی نند چھپ کر دریا کے کنارے بیٹھی

رہی۔ اُس نے سوہنی کو گھڑا چھپاتے دیکھ لیا + اور سوہنی سے پہلے گھر پہنچ کر بستر پر آرام سے لیٹ گئی ۔

سوہنی کی نند کو اب سوہنی سے بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے دل میں سوچا۔ کہ اس کم بخت نے میرے بھائی کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ اب میں بھی اس کا خاتمہ کر کے دم لوں گی۔ دُوسرے دِن سوہنی کی نند ایک کچّا گھڑا اُٹھا کر دریا کے کنارے گئی۔ جہاں رات کو سوہنی نے گھڑا چھپا کر رکھا تھا۔ وہاں اُس نے وہ کچّا گھڑا رکھ دیا۔ اور پکّا گھڑا وہاں سے اُٹھا لائی ۔

Taj Tahir Foundation

خاتمہ

اگلی رات ہر لحاظ سے مُصیبت کی رات تھی۔
ایک تو سوہنی کو اپنی نند کی حرکت کا کچھ علم نہ تھا۔ دُوسرے اُس رات بڑے زور کا طوفان آیا۔ جھکڑ اور اُس کے ساتھ موسلا دھا بارش۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج دنیا غرق ہو کے رہے گی۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ اُکھڑ کر دُور جا پڑے۔ پرندوں اور جانوروں کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ تھی۔ اور انسان بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔

آدھی رات ہونے کو آئی۔ مگر طوفان ابھی تک زوروں پر تھا۔ اِدھر سوہنی گھبرا رہی تھی۔ اُدھر مہینوال بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وُہ سوچتا تھا۔ کہ سوہنی آج کس طرح آئے گی؟

سوہنی نے تھوڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا۔ کہ دُنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں۔ جو مجھے عہد نباہنے سے

روک دے۔ جو ہو سو ہو۔ ضرور مہینوال کے پاس پہنچ کے ہونگی۔
آدھی رات کو وُہ خدا کا نام لے کر گھر سے نکلی۔ بارش اور جھکڑ کے طوفان سے ساری دُنیا سہمی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ موجیں آسمان کی خبر لاتی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوُا تھا۔ ہوا بڑے زور سے چل رہی تھی۔ مگر ان میں سے کوئی چیز بھی سوہنی کو نہ روک سکی۔ جھکڑ کے زور سے کئی بار اُس کے پاؤں زمین سے اُکھڑ گئے۔ موسلا دھار بارش زیادہ تیزی سے برسنے لگی۔ مگر سوہنی اپنے مقررہ وقت پر دریا کے کنارے پہنچ گئی!

جن جھاڑیوں میں اُس نے کل رات گھڑا چھپا کر رکھا تھا۔ وہاں سے جا کر گھڑا اُٹھایا۔ گھڑے کو ہاتھ میں لیتے ہی اُس کی چیخ نکل گئی۔ کیونکہ گھڑا کچّا تھا۔ گھڑے کی طرف سے نا اُمید ہو کر اُس نے دریا کی طرف دیکھا۔ دریا کی لہریں منہ پھاڑے اُسے نگلنے کے لئے بے تاب نظر آتی تھیں۔ سوہنی گھبرا کر بیٹھ گئی اور ہاتھ اُٹھا کر جناب الٰہی میں دعا کی۔ کہ " اے سب کی شرم اور لاج رکھنے والے خدا! آج میری بھی لاج رکھ۔

Taj Tahir Foundation

اَور مجھے ہمّت دے۔ کہ میں اپنا عہد پُورا کروں"۔

موت سوہنی کو سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ دفعتہً مہینوال کی تصویر اُس کی نظروں کے سامنے کھنچ گئی۔ اور وہ کہنے لگی۔ کہ "اے ہوا! میرا پیغام مہینوال کے پاس لے جا۔ اُس سے کہنا۔ کہ "تیری باندی نے اپنا عہد پورا کیا۔ اور آج اُسی عہد کو پُورا کرتے ہوئے اُس نے اپنی جان دریا کی لہروں کے سپرد کر دی"۔ یہ کہہ کر سوہنی اُٹھی اور وہی کچّا گھڑا لے کر پار جانے کے لئے دریا میں تیرنے لگی۔

ادھر مہینوال کو ایسے معلوم ہُوا۔ جیسے سوہنی کسی مُصیبت میں گرفتار ہے اور اُسے مدد کے لئے پُکار رہی ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں میں سے اُسے سوہنی کی فریاد سُنائی دے رہی تھی۔ بارش کے قطرے اُسے سوہنی کے آنسو معلوم ہو رہے تھے۔ وہ گھبرا کر اُٹھا۔ اور جھونپڑی سے باہر نکل کر دریا کی طرف بھاگ پڑا۔

سوہنی دریا کی طوفانی لہروں میں ابھی تھوڑی دُور بھی نہ تیرنے پائی تھی۔ کہ گھڑے نے جواب دے دیا۔

اُس نے جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارے۔ کہ کسی طرح اُڑکر دریا کے اُس پار جا پہنچے۔ مگر کہاں۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے گھڑا اُس کے ہاتھوں سے غایب ہو گیا۔ اور یہ سہارا بھی جاتا رہا۔؛

دریا کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر سوہنی کا رستہ روک رہی تھیں۔ کچھ دیر سوہنی نے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر آخر بے بس ہو گئی۔ بے بسی کی حالت میں مہینوال کو پکارا۔ اور کہا۔ "پیارے! دیکھ لے۔ تجھ سے عہد نبا ہنے کی کوشش میں جان دے رہی ہوں + اے آسمان! اے دریا کی لہرو! تم بھی گواہ رہنا۔ کہ جب تک میرا بس چلا۔ مَیں نے اپنے عہد کو نباہنے کی پوری پوری کوشش کی۔ مگر اب بے بس ہوں۔ اور اُسی کے نام کا وِرْد کرتے کرتے جان دے رہی ہُوں"۔؛

ہوا نے اس فریاد کو مہینوال کے کانوں میں پہنچا دیا۔ بجلی چمکی۔ تو اُسے نظر آیا۔ کہ اُس کا چاند دریا کی لہروں گھٹاؤں میں ڈُوب رہا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر اُس نے بے اختیار اپنے آپ کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

Taj Tahir Foundation

اور لہروں کے تھپیڑے کھاتا ہوُا سوہنی کے قریب جا پہنچا ؛

سوہنی میں ابھی کچھ جان باقی تھی۔ اُس نے جب مہینوال کو اپنے قریب پایا۔ تو ہاتھ پھیلا دیئے اور مہینوال نے بڑھ کر اُسے آغوش میں لے لیا ؛

اندھیرا زیادہ گہرا ہوگیا۔ مینہ زور سے برسنے لگا۔ دریا کی لہروں کا شور بھی بڑھ گیا۔ بجلی چمکی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے دو سچے دوست جنہوں نے آخری دم تک محبّت کا عہد نباہا۔ دریا میں تیرتے ہوئے دکھائی دئے۔ پھر لہروں نے ان دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا ؛

محبّت کا وعدہ پورا کرنے والے سچے دوستوں پر خدا کی رحمت ہو ؛

تمّت

اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپا اور سیّد حمید علی پبلشر نے دارالاشاعت پنجاب ریلوے روڈ لاہور سے شائع کیا۔

Taj Tahir Foundation

ننھی مُنّی کتابیں

ان کتابوں میں بہت ہی آسان اور پیاری زبان استعمال کی گئی ہے۔ سبق ایسے تیار کیے گئے ہیں۔ جن میں بچّے بیحد دلچسپی لیتے ہیں۔ اور جن سے اُن کا علم اور تجربہ بڑھتا ہے۔ جانوروں پر۔ پیڑوں پر۔ عمارتوں پر۔ تاریخ۔ سائنس کے آسان تجربوں پر جنہیں سیکھ کر بچّے اپنے آپ کو جادُوگر سمجھ لیتے ہیں۔ حفظِ صحت اور دُوسری ضروری چیزوں پر بہت چھوٹے چھوٹے سبق لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ننھی ننھی کہانیاں۔ آسان آسان اور پُر لُطف نظمیں ہنسی کی باتیں ایک سے بول اور بچّوں کے مذاق کی اَور چیزیں ان میں جمع کی گئی ہیں۔ کتابوں کے ٹائیٹل اور باقی چیزیں ایسی دلفریب بنائی گئی ہیں جنہیں دیکھکر بچّے بے حد خوش ہونگے۔ قاعدہ پڑھا کر یہ کتابیں بچّوں کے ہاتھوں میں دے دیجیے۔ اور سمجھ لیجئے کہ اُن کے دِل میں اُردو زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ ان پانچ کتابوں کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ ننھی کتاب۔ قیمت ۷ر۲ پائی

۲۔ منّی کتاب۔ قیمت ۶ر۱۰ پائی

۳۔ پیاری کتاب۔ قیمت ۷ر۳ پائی

۴۔ دلاری کتاب۔ قیمت ۶ر۹ پائی

۵۔ ہماری کتاب۔ قیمت ۶ر۵ پائی

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

اتحاد پریس بلڈنگ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپا اور سید حمید علی پبلشر نے دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع کیا۔

Taj Tahir Foundation